بغیرِ کتاب ہدایت کے اختلاف کرنے والوں کا انجام

﴿و من الناس من يجادل فى الله بغير علم و لا هدى و لا كتاب منير۞ ثانى عطفه ليضل عن سبيل الله له فى الدنيا خزى و نذيقه يوم القيامة عذاب الحريق۞ذلک بما قدمت يداک و ان الله ليس بظلام للعبيد۞﴾[الحج/۸-۱۰]

''بعض لوگ اللہ کے بارے میں کسی علم، ہدایت اور روشن کتاب کے بغیر جھگڑا کرتے ہیں، تکبر سے اپنا پہلو موڑتے ہوئے، تاکہ اللہ کی راہ سے بھٹکائے، اسے دنیا میں بھی رسوائی ہوگی اور ہم قیامت میں بھی اسے جلنے کا عذاب چکھائیں گے۔ یہ تیرے کرتوت کی وجہ سے ہے، اور اللہ تعالی یقیناً بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں''۔

آخری چارہ کار

تمام معقول اسباب وطرق، متعدد چیلنجوں، ترغیب وترہیب اور دینوی واخروی انجامِ بد سے بھی آگاہ کرنے کے بعد، چیلنج سے لاجواب ہونے کے باوجود بھی، گاہے بگاہے مختلف شرارتوں سے اہل ایمان میں شکوک وشبہات پروان چڑھانے اور اعدائے اسلام کو مواد فراہم کرنے کی کوششوں سے باز نہ آنے والوں کو لتاڑنے کا ایک ہی راستہ باقی ہے:

﴿فمن حاجک فيه من بعد ما جاء ک من العلم فقل تعالوا ندع ابناء نا و ابناء کم و نساء نا و نساء کم و انفسنا و انفسکم ثم نبتهل فنجعل لعنت الله على الكذبين۞﴾[آل عمران/ ٦١] ''پس جو کوئی آپ کے پاس واضح علم آجانے کے بعد بھی جھگڑنے سے باز نہ آئے تو آپ کہہ دیجئے کہ آؤ ہم اور تم اپنے اپنے بیٹوں کو، اپنی اپنی عورتوں کو بلالیں، اور ہم اور تم خود بھی حاضر ہو جائیں، پھر ہم سب اللہ کے سامنے عاجزی سے فریاد کرتے ہوئے جھوٹوں پر اللہ کی لعنت بھیجیں''۔

وما علينا الا البلاغ المبين

سوانح علمائے اہل حدیث

مولانا عبدالرشید انصاری رحمۃ اللہ علیہ

عبدالرشید صدیقی

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

ابھی شیخ الحدیث مولانا عبدالرشید ندوی کو الی رحمۃ اللہ ہوئے سال ہی گزرا تھا کہ بلتستان کی ایک اور مایہ ناز نامور دینی شخصیت مولانا عبدالرشید انصاری کا انتقال پر ملال ہوا، اور پہلا زخم مندمل نہیں ہو پایا تھا، اس جانکاہ حادثہ نے جماعتی حلقوں کو ہلا کے رکھ دیا۔ مولانا جس کو رحمہ اللہ لکھتے ہوئے قلم لرزاں ہے اور دل آزردہ، مگر انسان ہے کہ دارِ بقاء کے لیے ایک نہ ایک دن کوچ کرنا ہی ہے۔ بقول بلبل بلتستان یوا قربان علی مرحوم:

"کاٹھ کے گھوڑے پر سوار ہونے کے لیے آج کل اور پرسوں کی کوئی قید نہیں"۔ شخصیت کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو:

اگر دنیا پر کسے پائندہ بودے ابوالقاسم محمد زندہ بودے ﷺ

مولانا کا تعلق بلتستان کے مشرق میں کنٹرول لائن کے قریب ایک گاؤں سکسہ سے تھا، جہاں آپ بلاتفریق مذہب وملت ایک قد آور دینی وعلمی شخصیت کے طور پر نمایاں تھے اور بلتستان کے صف اول کے اہلحدیث علماء میں شمار ہوتا تھا۔ آپ تقریباً 75 سال قبل مشہور داعی ومبلغ حافظ عبدالرحمٰنؒ کے گھر تولد ہوئے۔

حافظ صاحب کو اس زمانے میں بلتستان بھر میں واحد حافظ قرآن ہونے کا شرف حاصل تھا۔ آپ دہلی سے درس نظامی کے ساتھ حفظ قرآن پاک بھی مکمل کر کے تشریف لائے تھے اور اپنے ذوق وشوق اور مطالعہ وتحقیق سے رائج الوقت آبائی مذہب چھوڑ آئے تھے جس کے آپ پیشوا بھی تھے، اور یہی پیشوائی ذریعہ معاش بھی تھا۔ آپ دوران وعظ مزاحاً فرمایا کرتے تھے کہ میں معاش کو مستحکم کرنے کے لئے پڑھنے گیا تھا لیکن اب بجائے لینے کے دینے پڑ گئے۔

کرنے گئے تھے اس سے تغافل کا ہم گلہ کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

اور اب توحید وسنت کا علمبردار، مسلک حقہ کا شیدا بن کر سفر وحضر کی صعوبتوں سے قطع نظر دعوت وتبلیغ کا بیڑا اٹھائے والہانہ بیباک مجاہد بننے کا شرف حاصل ہوا۔ آپ کی شیریں بیانی کی یاد پرانے وقتوں کے لوگوں کو اب بھی مضطرب کر دیتی ہے۔ اور لوگ آپ کی اولاد واحفاد کو حافظ جی کی نسبت سے قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ مسلک حقہ کی اشاعت میں آپ کا گھرانہ اپنی مثال آپ ہے۔ ایں خانہ ہمہ آفتاب است۔

حافظ جی کو اللہ غریق رحمت کرے جب انہیں معلوم ہوا کہ مفتی اعظم، بحر العلوم مولانا حافظ کریم بخش امیر جماعت و

ناظم دارالعلوم صاحب فراش ہے، تو اپنے گاؤں سے تین دن کی پیدل مسافت طے کر کے عیادت کو پہنچے اور حسب عادت کچھ دن ٹھہر کر واپسی کا ارادہ ظاہر کیا تو مفتی صاحب نے مزید ٹھہرنے پر اصرار فرمایا مگر حافظ جی اپنی مجبوری بیان کر کے رقت آمیز انداز میں بغلگیر ہوئے۔ مولانا موصوف اپنی تبحر علمی وجلالت قدر کے باوجود حافظ صاحب کی دعوت وفکر کی بہت قدر دانی کرتے اور عزت افزائی فرماتے تھے۔

المختصر حافظ جی اثنائے سفرِ واپسیں دریائے شیوک عبور کرتے ہوئے لہروں کی نذر ہوگئے۔ اس عالم باعمل و داعی بے بدل کی نعش مبارک آسانی سے برآمد ہوئی، اور یہیں برلب دریا مدفون ہوئے جو آج بھی

برمزار ماغریباں نے چراغے نہ گلے نے پر پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

کا نظارہ پیش کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو نور سے بھر دے۔ واقفانِ حال کا بیان ہے کہ جب یہ جانکاہ خبر غواڑی میں مولانا کریم بخش تک پہنچی جو خود بھی ہنوز علیل تھے، بہت روئے اور بآواز بلند فرمایا "اے حافظ تو میری عیادت کے لیے آئے تھے، مجھ سے آگے چلے گئے"۔ اور تقریباً اسی تکلیف میں کچھ عرصہ رہ کر علم وعمل کا یہ آفتابِ جہاں تاب بھی غواڑی میں غروب ہوگیا۔ اللھم اغفر لہ و ارحمہ۔

اس طرح پے در پے واقع ہونے والے حادثات سے جماعتی حلقوں کو جو صدمات پہنچی ہوں گی، ان کی کیفیت اُس زمانے کے لوگ ہی بہتر بیان کر سکتے ہیں۔ یہ تقریباً 1958 کے واقعات ہیں۔

آج حافظ جی کو اس جہان فانی سے رخصت ہوئے تقریباً 45 سال گزر چکے ہیں۔ مگر ان کا مشن زندہ ہے اور ان شاء اللہ نہ صرف زندہ بلکہ تا قیامت ترقی کی شاہراہ پر گامزن رہے گا۔

موت التقی حیاۃ لا انقطاع لھا قد مات قوم وھم فی الناس احیاء

حافظ صاحب نے جس ماحول اور علاقائی صورت حال میں دین کی خدمت کا سلسلہ شروع کیا، اس میں وہ منفرد حیثیت کے مالک تھے۔ حافظ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمات پر ایک مکمل کتاب کی ضرورت ہے۔ یہاں تو صرف جملہ معترضہ کے طور پر ذکر ہوا ہے۔

بہر حال اس معزز گھرانے میں انصاری (مرحوم) حافظ جیؒ کا بڑا صاحب زادہ تھا۔ آپ نے قرآنی تعلیم اور ابتدائی اسلامی علوم اپنے والد مرحوم سے حاصل کی اور پرائمری، سکسہ سکول سے پاس کرنے کے بعد والد گرامی نے آپ کو بغرض حصول علم دینی اس مشکل ترین دور میں پاکستانی شہروں کی طرف روانہ کر دیا جب دشوار گزار راستوں، گہری کھائیوں، پیچیدہ گھاٹیوں اور خطرناک ویرانوں سے گزر کر مشکل سے راولپنڈی پہنچ جاتے تھے۔ قصہ مختصر آپ نے پاکستان پہنچ کر مختلف دینی اداروں میں رہ کر استفادہ کیا، خاص کر سندھ اور کوئٹہ کے بعض مدارس کا آپ خاص طور پر ذکر کیا کرتے تھے۔ آخر میں دارالعلوم سعودیہ بندر روڈ کراچی سے فارغ ہوئے۔ اور کراچی بورڈ سے فاضل کا امتحان بھی پاس کیا۔

ان سطور کے راقم کو اچھی طرح یاد ہے کہ مولانا انصاری صاحب 1963ء میں فارغ ہو کر اپنے گاؤں تشریف لائے اس وقت آپ کا بھائی جناب عبداللہ اصلاحی (موجودہ ڈپٹی ڈائریکٹر ایجوکیشن) راقم کے گاؤں میں ٹیچر تعینات ہو کر آیا تھا۔ آپ ان

سے اور دیگر جماعتی احباب سے ملنے تشریف لائے تو ہمارے چچا جو امام وخطیب بھی تھا، آپ کا استقبال کرتے ہوئے بہت روئے اور فرمایا کہ اگر حافظ صاحبؒ زندہ ہوتے تو کتنی خوشی محسوس کرتے۔ آپ کچھ عرصہ کراچی میں مختلف جگہوں پر درس و تدریس اور خطابت کے فرائض سرانجام دیتے رہے تھے۔ دھلی والوں کے معاشرے میں گھل مل کر رہنے کی وجہ سے زبانِ اردو معلیٰ میں خوب دسترس حاصل تھی۔ خطابت کی خمیر خاندانی طور پر گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔

تصنیف کے میدان میں بھی اپنے وقت کے باصلاحیت لکھاریوں میں سے تھے، بلکہ اس میدان میں جماعت کے گنے چنے لوگوں میں سے تھے۔ ''وادی بلتستان کے مذہبی حالات'' اور ''دعوتِ اصلاح'' بجواب: دعوت اتحاد، اپنے وقت کی معرکۃ الآراء تصنیفات میں شمار ہوتی تھیں۔ اس پر آشوب دور کی نزاکت کو پیش نظر رکھا جائے تو ان کی افادیت واضح ہو جاتی ہے اور آج بھی یہ کتابچے بین المذہبی بحث ومباحثے کا موضوع بنی ہوئی ہیں، جس سے ان کی اہمیت اجاگر ہو جاتی ہے۔ انہی دنوں ہی آپ کو علاقے میں کافی ذہنی کوفت اور پریشانیوں سے بھی واسطہ پڑتا تھا۔ وطن عزیز لوٹنے کے بعد سے آپ نے اپنی بیشتر زندگی اور ٹیچر O.T کی حیثیت سے سرکاری ملازمت میں گزاری۔

جماعتی پروگراموں اور جلسوں میں نہایت اہتمام سے شرکت فرماتے تھے، اور دور دراز کی مسافت طے کر کے حاضر ہو جاتے تھے۔ دوست احباب کا حلقہ بہت وسیع تھا، ایسے مواقع پر کچھ دن ٹھہر کے ہر ایک سے ملاقات کرنے میں بہت خوشی محسوس کرتے۔ آپ حساس طبیعت کے مالک تھے۔ غیرت وحمیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

دورانِ ملازمت آفیسران بالا کی طرف سے سیدھا سادھا مولوی سمجھ کر نظر انداز کرنے اور عصری علوم سے بے بہرہ ہونے کا طعنہ محسوس کرتے تو فوری طور پر ردعمل ظاہر فرماتے اور اردو دانی ومضمون نویسی کے لیے چیلنج فرماتے۔ اسی جذبے کے تحت خوب محنت کر کے دوران ملازمت (B.A) کا امتحان بھی پاس کر لیا۔ آپ مزاحاً فرمایا کرتے تھے کہ ان اسکولی لوگوں کے طعنے نے مجھے B.A کرنے پر مجبور کر دیا۔ اور فرماتے کہ مولوی صاحبان عزم کریں تو معمولی کوشش سے بی۔اے، ایم۔اے کر سکتے ہیں بہر حال اس قسم کی نوک جھونک کے واقعات بڑے مزے سے بیان فرماتے رہتے تھے۔

آپ شکستہ خط لکھنے میں بدنام کی حد تک معروف تھے۔ مگر اسی شکستگی میں بھی پختگی کا یہ عالم تھا کہ یک سر مو نوک قلم جنبش نہ کرتا اور صفحات کے صفحات مختصر وقت میں لکھ ڈالتے، طبیعت میں قناعت کا عنصر بھرا ہوا تھا۔ زندگی میں بہت ساری صعوبات اور نامساعد حالات جھیل کر کندن بن چکے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آسائش وراحت کے شرف سے بھی نوازا۔ مگر بندہ ہر حال میں صابر وشاکر تھا۔ تنگی میں صبر کا دامن نہیں چھوڑا اور حالت عیش میں شکر وذکر سے غافل نہیں رہا۔ رات سہ پہر اٹھنے کے عادی تھے، تہجد کے بعد اللہ تعالیٰ کے حضور گڑگڑا کر دعا مانگنے کی عادت آخر وقت تک برقرار رہی۔ المختصر بہت سی خوبیوں سے مزین تھے۔

مسلک حقہ اہلحدیث سے بے انتہا عقیدت تھی۔ ''اہلحدیث'' کے علاوہ کوئی اور لفظ قبول کرنے کو تیار ہی نہ ہوتے، مگر دوسرے مذاہب کے ساتھ رواداری اور نرمی سے پیش آنے کی تاکید فرماتے، خود بھی کوئی فرقہ وارانہ بات نہ کرتے، معالعہ

کا شوقین تھا، آپ کی اپنی اچھی خاصی لائبریری تھی۔ اہلحدیث کی حقانیت پر مجلّہ التراث میں سلسلہ وار مضمون بھی لکھ رہے تھے۔ (جس کی اشاعت ان شاء اللہ جاری رہے گی۔) مگر اب: آں قدح بشکست وآں ساقی نماند۔ وفات سے کچھ عرصہ قبل راقم نے ان کی فرمائش پر مولانا عبدالکریم عاصم مرحوم کا سفرنامہ دے دیا تھا، دوسری ملاقات میں بہت خوشی کا اظہار فرمارہے تھے۔ کہ اس کتاب کو پڑھ کر بہت مزہ آیا، پھر مولانا نذیر احمد رحمانیؒ کی کتاب: اہلحدیث اور سیاست بھی طلب فرما چکے تھے، مگر اسکی نوبت نہیں آئی۔

جہاں تک سیاست کا تعلق ہے، اس بارے میں آپ آزادانہ خیالات رکھتے تھے۔ اور خوب تبصرے فرماتے تھے۔ حتیٰ کہ بھٹو کے بعض اقدامات کے بڑے مداح تھے۔ اسی طرح نواز شریف و ضیاء الحق کے اچھے پہلوؤں کی تعریف کرتے تھے۔ مگر مخالف پارٹی یا لیڈر کے خلاف زہر افشانی کبھی نہیں کرتے تھے۔ اپنے آبائی گاؤں کو خیر باد کہنے تک جامع مسجد کے خطیب رہے، بلکہ آپ ہی وہاں کے جماعتی امور کے روح رواں تھے۔ وعظ وخطابت بہت سادہ ودلنشین، آواز میں یکسانیت تھی۔ جسم مائل بفربہ، متبسم چہرہ، قد اونچا، چال میں چھوٹے قدم کے ساتھ جلدی جلدی چلنے کے عادی تھے۔ گویا کہ دور سے پہچانے جاتے کہ مولانا انصاری تشریف لارہے ہیں۔

کرگل کے بے مقصد جنگ کے دوران جہاں دیگر سرحدی علاقے متاثر ہوئے اور لوگوں کو در بدر کی ٹھوکریں کھانی پڑیں، مولانا صاحب کا گاؤں بھی اس شر سے محفوظ نہیں تھا۔ روز روز کی گولہ باری سے تنگ آکر محفوظ مقامات پر آئے، پھر حالات نارمل ہونے کے باوجود واپس گھر نہ جاسکے، پھر چلتے چلتے بھائی عبداللہ اصلاحی صاحب کا ٹرانسفر گلگت سائیڈ ہوگیا، بھتیجے اسلام آباد میں باروزگار ہوئے تو مولانا صاحب بادلِ ناخواستہ ان کے اصرار پر گلگت و اسلام آباد میں رہنے لگے۔ مگر گاؤں کی یاد بہت ستاتی رہی۔ اب تو طبیعت میں بھی وہ خنکی نہیں رہی، بار بار ہسپتال کے محتاج رہنے لگے، کبھی مثانے، کبھی گردے کی تکلیف سر اٹھانے لگی، آخری دنوں میں کچھ یوم تک ہسپتال میں زیر علاج رہے۔ جب فارغ ہوئے تو کافی صحت بحال ہوئی تھی۔ عیدالاضحیٰ کے موقعے پر راقم کو اپنے ساتھ دو یوم ٹھہرے بغیر گھر سے جانے کی اجازت نہیں دی۔ عصا کے سہارے چلتے تھے۔ گفت وشنید میں کوئی شکایت نہیں تھی۔ گھر کے اندر باجماعت نماز میں شریک ہوتے۔ فرمایا: ان شاء اللہ زندگی نے وفا کی تو گرمیوں میں بلتستان ضرور آؤں گا۔ اور غمناک آنکھوں سے یہ بھی فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ بقیہ زندگی گھر اور گاؤں میں گزاروں۔

ہم واپس غواڑی پہنچ کر 10 یوم ہی گزرے تھے کہ اچانک اطلاع ملی کہ آپ اس جہانِ ناپائیدار کو خیر باد کہ چکے ہیں۔ زمین پاؤں تلے سے سرکنے لگی۔ صبح تک سارے جماعتی حلقوں میں کہرام مچ چکا تھا۔ بہرحال یہ عالم باعمل اور پیارو محبت کا پیکر 16 مارچ 2002ء بمطابق یکم محرم الحرام ۱۴۲۳ ہجری بروز ہفتہ شام تقریباً سات بجے اسلام آباد میں آپ کے بھتیجے عبدالرحمٰن عثمانی اور عبدالستار سلفی وغیرہ کے ہاں سے عالم جاودانی کو روانہ ہوگئے۔ **انا للہ و انا الیہ راجعون** ۞

جب یہ روح فرسا خبر اسلام آباد اور راولپنڈی میں پھیل گئی تو راتوں رات، احباب جماعت اور آپ کے عزیز واقارب اور